رسائل و مسائل

مغربی تہذیب کا سیلاب

مغربی تہذیب کا جو سیلاب ہمارے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لیے چلا جا رہا ہے، ہم اس کا مقابلہ کس طرح کر سکتے ہیں؟

اس سیلاب کا مقابلہ اس وقت آپ اس کے سوا کسی اور طرح نہیں کر سکتے کہ اس کے نقصانات پورے دلائل کے ساتھ لوگوں کے سامنے لائیں۔ کیونکہ آپ کے پاس وہ طاقت نہیں ہے جس سے آپ سیلاب کے دھارے کو روک دیں، وہ ذرائع نہیں جن سے آپ بند باندھیں، وہ طاقت نہیں ہے جس سے آپ ان لوگوں کا ہاتھ پکڑ سکیں جو یہ سیلاب لیے چلے آ رہے ہیں۔ جب یہ طاقت نہیں ہے، یہ ذرائع نہیں ہیں، تو اب آپ جو کچھ کر سکتے ہیں، وہ یہ ہے کہ نہایت معقول دلائل کے ساتھ ہر اس شخص کو جو اس سیلاب میں بہا جا رہا ہو، بچانے کے لیے اس کو بتائیں کہ اس کے یہ یہ نقصانات ہیں۔ اس کے بعد بہنے والا بہے گا، اور جو بہنا چاہتا ہو، اور بہہ رہا ہو اسے آپ روک نہیں سکتے۔ آپ روک تو اسی کو سکتے ہیں جس کے دل میں برائی کا خوف ابھی کچھ باقی ہے۔ (سید ابوالاعلیٰ مودودی)

جہاد اور جہاد کشمیر

کیا امپیریلزم کے خلاف جنگ، جہاد ہے؟ اگر ہے تو کیسے؟

جہاد فی سبیل اللہ کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے کیا جائے۔ دوسرا جو مظلوموں کو ظالموں سے نجات دلانے کے لیے کیا جائے۔ تیسرا جو خود اپنے دفاع کے لیے کیا جائے، یعنی کسی مسلمان ملک پر جب کوئی دشمن حملہ آور ہو تو اس کے باشندوں کا فرض ہے کہ وہ مدافعت کریں اور ملک کو دشمن کے قبضے میں جانے سے روکیں۔ اگر ان شکلوں میں پیش نظر خدا اور اس کی رضا ہو گی تو جہاد فی سبیل اللہ ہو گا، اور اگر خدا کی رضا پیش نظر نہ ہوئی تو جہاد نہ ہو گا۔ محض کسی کے خلاف جنگ چھیڑ دینا جہاد نہیں ہو سکتا۔ اس لحاظ سے اگر یہ دیکھا جائے کہ امپیریلزم

کے اندر طغیانی ' سرکشی ' اپنی حد سے تجاوز اور دوسروں پر زیادتی پائی جاتی ہے ' تو وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کی مخالفت کی جائے ۔ مگر نیت یہ ہونی چاہیے کہ انسان پر سے انسان کی حاکمیت کو ہٹایا جائے اور اللہ کی حاکمیت قائم کی جائے ۔ یہ مقصد ہو گا تو وہ جہاد ہو گا ۔ اسلام کے نقطہ نظر سے انسان ہر ایک سے آزاد ہو ' مگر اسے خدا کا غلام ضرور ہونا چاہیے ۔ انسان اگر خدا کی غلامی سے بھی آزاد ہو جائے تو پھر کسی آزادی کی کوئی قدر و قیمت نہیں ۔ (س ۔ ا ۔ م)

کشمیر کی جنگ آزادی کو کس حد تک جہاد کہا جا سکتا ہے ؟

پوری طرح ! اس کے جہاد ہونے میں کوئی کسر نہیں ہے ۔ بس یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ لڑائی میں نیت کیا ہے ؟ اگر کفر کے تسلط سے آزاد ہو کر مسلمانوں کی زندگی بسر کرنے کی نیت ہو تو بلاشبہ یہ جہاد ہے ۔ لیکن اگر کوئی اور نیت ہو تو پھر یہ جہاد نہیں ہو سکتا ۔ اللہ تعالیٰ یہ دیکھتا ہے کہ آیا یہ میری راہ میں مجاہد ہیں یا کسی اور کی راہ میں ۔ (س ۔ ا ۔ م)

مسئلہ دوسری شادی کا

ایک ضروری اور ایک اہم سوال کرنا ہے ۔ میں یہ مانتی ہوں کہ دوسری شادی مرد کے لیے حلال ہے ' لیکن میں معلوم کرنا چاہتی ہوں :

۱ ۔ کیا ایسا بھی کوئی مسئلہ ہے کہ یہ ضروری ہے ۔ کیا یہ جائز ہے کہ بغیر کسی مقصد کے مرد محض شوق کی وجہ سے دو یا زائد شادیاں کریں ۔

۲ ۔ اگر ایک بیوی ایسے مرض میں مبتلا ہے کہ وہ گھریلو اور ازدواجی تمام معاملات میں شوہر کی ضروریات تو پورا کر سکتی ہے ' لیکن وہ زیادہ بچے پیدا نہیں کر سکتی ' دوسری شادی کرنے سے اس جوڑے کی محبت اور بہترین ازدواجی زندگی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی ' اور دوسری شادی کی پریشانی سے بیوی کی بیماری میں اضافہ یقینی ہے ' تو ایسے حالات میں شادی کرنا بہتر ہے یا نہ کرنا ۔

۳ ۔ امہات المومنین یا صحابیات میں سے کسی کی کوئی مثال موجود ہے کہ انھوں نے خود اپنے شوہر کی اس کی خواہش یا ضرورت پر شادی کروائی ہو ۔

۴ ۔ اگر ایک بیوی نسل بڑھانے کے لیے ' یا شوہر کی خواہش پوری کرنے کے لیے ' اس کی دوسری شادی کروائے تو اس کے لیے کیا اجر ہے ۔

۵ ۔ نکاح کا مقاصد ' نسل بڑھانا ہو ' دینی مصلحت ہو ' یا شوق یا کچھ اور ' جس کے لیے دوسری شادی کی جائے ' اس کے فائدے اور نقصانات کیا ہوں گے ' جبکہ میاں بیوی کا تعلق مثالی ہے ۔

۶ ۔ اگر اسلام نے دوسری شادی کے حلال ہونے کے بعد اس کو مستحسن بھی کہا ہے ' تو پھر ہمارے معاشرہ میں اس کو اتنا برا کیوں سمجھا جاتا ہے اور خواتین اس کے لیے کیوں تیار نہیں ہوتیں ۔

۷۔ رسول ؐ نے امہات المومنین کو الگ الگ گھر دیے تھے ' یا ایک گھر میں سب رہتی تھیں ۔

۸۔ اگر ایک تحریکی خاتون خود ' شوہر کی خواہش یا اس کی کچھ ضرورت کی بنا پر اس کی دوسری شادی کروائے تو اس کا تحریک کو کیا فائدہ ملے گا۔ یہ بیوی کا خود اپنے آپ کو تو آزمائش میں ڈالنا نہیں ہو گا۔ کیا اس میں دینی مصلحت ہو سکتی ہے ' جبکہ بیوی خوف خدا اور خوف آخرت رکھنے والی ہے اور صرف اللہ کی رضا ہی مطلوب ہے ۔

۹۔ اگر بیوی اپنے شوہر کی دوسری شادی کی مخالفت کرے تو شریعت کیا کہتی ہے ؟

۱۔ قرآن نے مرد کو ایک سے زائد شادیاں کرنے کی صرف اجازت دی ہے ' ہدایت نہیں کی ہے نہ حکم دیا ہے ۔ اس لیے دوسری شادی کرنا نہ ضروری ہے نہ فرض ' صرف مباح ہے ۔

دوسری شادی کرنے کا فیصلہ کرنے کا اختیار مرد کو دیا گیا ہے ' اور اس اختیار کو صرف عدل کی شرط کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے ۔ یعنی وہ بیویوں کے درمیان سارے معاملات میں مکمل عدل کرے ۔ عدل کرنے پر قادر نہ ہو تو ایک بیوی پر اکتفا کرے ۔ اس کے علاوہ کوئی دوسری شرط عائد نہیں کی گئی ہے کہ اس کی غرض کیا ہو ' مقصد کیا ہو ' اس کو ضرورت ہے یا نہیں ' وغیرہ وغیرہ ۔ کیونکہ پھر عدالت اور پنچایت اور فریق ثانی کی دخل اندازی ضروری ہو جاتی اور بے پناہ مفاسد کا دروازہ کھلتا جاتا ۔ خصوصاً خانگی زندگی میں یہ مفاسد بہت خرابی کا سبب بنتے ۔ مرد کو اختیار دینے سے بھی مفاسد پیدا ہو سکتے ہیں ' لیکن ان کا امکان کم ہے ' اور ان کا مداوا آسان ۔

۲۔ دوسری شادی کرنے سے اگر ازدواجی زندگی اور باہمی محبت متاثر ہوتی ہے ' جو دونوں کو عزیز ہے ' تو یہ شوہر کے دل کا کام ہے ' اس کی محبت ہے ' یا بیوی کی محبت کا زور ہے ' کہ وہ اس کو دوسری شادی سے باز رکھے ۔ اس سلسلہ میں قانون کی مداخلت کی گنجایش نہیں ۔

بعض دفعہ بچے پیدا نہ ہونے کا سبب مرد میں ہوتا ہے ' اس لیے بچوں کے لیے ازدواجی زندگی بگاڑنے سے پہلے طبی تحقیق بھی کر لینا چاہیے ۔ دوسرے یہ کہ اس کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ دوسری بیوی سے لازماً بچے پیدا ہوں گے ' یا صحت مند اور صالح ہوں گے ' یا زندہ رہیں گے ۔ اس لیے ' الا یہ کہ کوئی شدید معاشرتی ضرورت ہو ' میری رائے میں مرد کو پیار و محبت کا ازدواجی تعلق نہ بگاڑنا چاہیے ' اور اولاد کے بارے میں سورۃ الشوریٰ کی یہ آیت سامنے رکھنا چاہیے : ''اللہ جس کو چاہتا ہے لڑکیاں دیتا ہے ' جس کو چاہتا ہے لڑکے ' یا دونوں ' اور جس کو چاہتا ہے بے اولاد رکھتا ہے'' ۔

۳۔ عرب معاشرہ میں دوسری شادی کا عام رواج تھا ' اسی لیے اعتراض عموماً نہ ہوتا ہو گا ۔ اسی لیے پہلی بیوی کے شادی کروانے کا سوال ہی پیدا نہ ہو گا ۔ میرے علم میں ایسی کوئی مثال نہیں ۔

۴۔ صبر اور قربانی کا اجر اللہ کے پاس ہوتا ہے ' وہ جتنا چاہے دے ۔ بہرحال بیوی کو یہ قربانی دیتے ہوئے اپنی استطاعت اور زندگی کے بارے میں غور کر لینا چاہیے ۔ اگر اس کی زندگی میں زیادہ بگاڑ پیدا

ہوا' وہ حسد اور غیبت جیسی برائیوں میں مبتلا ہوئی' تو وبال' اجر سے زیادہ ہو سکتا ہے۔

۵۔ اگر میاں بیوی کا تعلق مثالی ہو تو شوہر صرف اپنے شوق پورا کرنے یا نسل بڑھانے کے لیے اس تعلق کو کیوں خراب کرنا چاہے گا!

۶۔ دوسری شادی کی صرف اجازت دی گئی ہے' اس کے مستحسن ہونے کی کوئی دلیل میرے علم میں نہیں۔ ہاں' مودت' رحمت اور سکینت کے ازدواجی تعلقات شریعت میں عین مطلوب ہیں۔

کوئی انسان بھی اپنی محبت اور اپنی مملکت میں شریک و سہیم اور حریف کو برداشت نہیں کرتا۔ عورت کی تو ایک ہی مملکت اور محبت ہوتی ہے: شوہر کا دل اور اس کا گھر۔ چنانچہ یہ بالکل فطری ہے کہ وہ دوسری بیوی کو برداشت نہ کرے۔ ہمارے معاشرے ہی میں نہیں' ہر معاشرے میں۔ ہاں' جہاں معاشرتی رواج بن گیا ہے وہاں فطرت اس کی عادی ہو جاتی ہے۔

۷۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امہات المومنین کو الگ الگ گھر دیے تھے۔ شرعاً ہر بیوی کا یہ حق ہے کہ اسے الگ رہائش دی جائے جہاں وہ تنہا مختار ہو۔

۸۔ دوسری شادی کرانے کے لیے بیوی کو آمادہ کرنا' اور اس کے لیے تحریکی اور دینی مصلحت کو بنیاد بنانا' ایک بے بنیاد سی بات ہے۔ الا یہ کہ تحریکی منفعت بالکل اظہر من الشمس ہو' قائل کرنے کی بھی ضرورت نہ پڑے۔ آزمائش میں ڈالنے کے سلسلہ میں شق ۴ پر غور کر لیں۔

۹۔ بیوی دوسری شادی کی مخالفت کر سکتی ہے۔ لیکن نرمی' محبت اور حکمت کے ساتھ کرے۔ اگر شوہر نہ مانے اور دوسری شادی کر لے تو اپنے حقوق کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ اگر گزر ناممکن ہو' اور اچھی ازدواجی زندگی ممکن نہ ہو' تو خلع کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کے لیے کوئی راستہ نہیں۔ اس کے علاوہ کوئی قانونی راستہ ہوتا تو پھر مرد آشنائیاں کرتے پھرتے' جو یورپ میں عام ہے۔

جہاں تک آپ کا تعلق ہے' تو آپ کے حالات تفصیل سے جانے بغیر صائب مشورہ دینا مشکل ہے۔ اگر آپس کا تعلق بہترین ہے' آپ اتنی بیمار نہیں' بچے بھی ہیں لیکن کم' تو شوہر کس لیے شادی کرنے کے خواہاں ہیں۔ آپ کے حالات میں بہتر یہی لگتا ہے کہ آپ محبت کے زور پر انھیں باز رکھنے کی کوشش کریں۔ کامیاب نہ ہوں تو حالات سے سمجھوتہ کر لیں۔ الگ گھر کی کوشش کریں۔ پھر بھی حالات بگڑیں تو آپ کی زندگی' آپ کی اپنی ہے اس کی فلاح کے لیے آپ اللہ کے سامنے جواب دہ ہیں۔ زندگی خراب نہ کریں۔ مگر سوکن کی خرابی سے بچنے کے لیے زیادہ بڑی خرابی میں بھی نہ پڑ جائیں۔ جو کچھ کریں خوب سوچ سمجھ کر' نتائج و عواقب کا پورا اندازہ کر کے کریں۔ اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔

(خرم مراد)

احکام میں سختی اور نرمی

"تغیر احکام بلحاظ تغیر زمانہ و احوال" (اکتوبر '۹۵) پڑھنے سے ذرا مایوسی ہوئی ہے۔ اس وقت پورا معاشرہ بدامنی ' فحاشی ' ڈاکہ زنی ' قتل اور دیگر ہر قسم کے جرائم کا شکار ہے۔ اس کے تدارک کے لیے ایک ہی راستہ ہے کہ ہم قرآن اور حدیث کے واضح احکامات کی روشنی میں جرائم پیشہ افراد کے لیے یہ دنیا تنگ کر دیں۔ لیکن اس مضمون میں مجرموں کو رعایت دینے کے لیے جو دلائل دیے ہیں اس سے مجرم اور بھی دلیر ہوں گے۔ کیا یہ وقت موزوں تھا کہ آپ یہ ترجمان القرآن میں شائع کرتے۔

یہ مضمون حافظ ابن قیم کی مشہور کتاب اعلام الموقعین سے ماخوذ ہے۔ قرآن و سنت کے علم و فہم اور دینی غیرت و حمیت کے لحاظ سے ان کا درجہ بہت بلند ہے ' اور وہ امام ابن تیمیہ کے شاگرد رشید تھے۔ لیکن کسی بات کے صحیح ہونے کے لیے صرف یہی بات کافی نہیں کہ کہنے والے کا مقام بتا دیا جائے۔ تغیر احکام کا اصول ایک انتہائی اہم اور بنیادی اصول ہے۔ تقریباً تمام ائمہ و فقہا نے کسی نہ کسی انداز میں اس کو پیش کیا ہے۔ اس اصول کی اہمیت کو بھی حافظ ابن قیم نے مقالہ کے آغاز ہی میں بڑے دل نشین انداز میں واضح کیا ہے ' کہ شریعت سراسر عدل و فلاح پر مبنی ہے ' اور اس اہم اصول سے ناواقفیت کی وجہ سے بہت خرابی اور فساد پیدا ہو رہا ہے۔

آپ کو بھی اس سے اتفاق ہے کہ یہ اصول صحیح ہے اور شریعت کا بنیادی اصول ہے۔ آپ کو تشویش و اعتراض اس لیے ہے کہ اس زمانہ میں اس کو بیان کرنے سے لوگوں کو چھوٹ مل جائے گی اور جرائم پیشہ لوگ بری ہو جائیں گے۔ چنانچہ آپ کی رائے میں اس وقت اس اصول کو بیان نہ کرنا چاہیے تھا۔

اس مضمون کی اشاعت کے بغیر ہی ' دین پر عمل میں انحطاط کی جو کیفیت ہے ' اور مجرم جس طرح پاکستان میں وندناتے پھر رہے ہیں ' اس کے پیش نظر آپ نے انحطاط عمل اور مجرمین کی چھوٹ کا جو اندیشہ ظاہر کیا ہے اس میں کوئی وزن نہیں محسوس ہوتا۔ اس قسم کے اندیشوں کی وجہ سے دین کے اہم اصولوں کے بیان کرنے سے رک جانا ' دین کے لحاظ سے بھی ایک غلط بات ہوتی۔ فی زمانہ جو فساد ہے اس کی خرابی کی وجوہات میں جہاں ایمان کی کمزوری ' طبیعتوں کا بگاڑ اور نظام کی خرابی شامل ہیں ' وہاں شریعت کا جامد اور بوجھ بن جانا بھی ہے۔ یہود نے بھی شریعت کو اسی طرح جامد اور بوجھ بنا دیا تھا۔ اسی لیے حضور نبی کریم ؐ کے بارے میں قرآن نے کہا ہے کہ آپ نے نہ صرف خبائث کی حرمت قائم کی بلکہ طیبات کی حرمت کو ختم کر کے ان کو حلال کیا ' اور دین کے نام پر جو بوجھ اور بیڑیاں لوگوں کے اوپر رکھ دی گئی تھیں ' ان کو ہٹایا اور توڑا (الاعراف)۔ چنانچہ آپ غور کریں گے تو دور جدید میں اسلامی تہذیب کے احیا اور تشکیل نو کے لیے یہ مقالہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ ترجمان القرآن میں سب سے پہلے ۱۹۳۷ میں سید مودودی نے چھاپا تھا ' پھر ۱۹۵۹ میں انھی کی ہدایت پر مولانا خلیل حامدی نے

دوبارہ چھاپا تھا۔ (خ۔م)

دارالکفر میں رہایش

لوگ کہتے ہیں کہ دارالکفر میں رہنا مسلمان کے لیے جائز نہیں۔ بعض تفاسیر کے مطابق سورہ النساء کی آیت نمبر ۹۷ کی روشنی میں ایک مسلمان انگلینڈ میں نہیں رہ سکتا' گو کہ یہاں کوئی روک ٹوک نہیں اور دین کے تمام ارکان 'مع تبلیغ' ادا کرنے کی آزادی ہے۔ لیکن حکومت کو اسلامی حکومت بنانے کا تصور نہیں۔ ایسی صورت حال میں یہاں رہنا مناسب نہیں۔ ایک عالم دین کہتے ہیں آپ تبلیغ کی نیت سے رہ سکتے ہیں تاکہ جو مسلمان راہ سے ہٹ گئے ہیں ان کی اصلاح کریں۔

فی زمانہ دارالکفر میں رہنا ناجائز ہونے کی بات میرے نزدیک صحیح نہیں ہے۔

۱۔ فی زمانہ مدینہ کی طرح کوئی دار الھجرت یا دارالاسلام نہیں 'جہاں منتقل ہو جانے کا حکم اللہ اور اس کے رسول نے دیا ہو۔ مدینہ کی طرف ہجرت کے احکام کا ہر زمانے میں اطلاق صحیح نہیں ہے۔ بہت سے علما کے نزدیک فتح مکہ کے بعد ان معنوں میں ہجرت کا حکم منسوخ ہو گیا۔

۲۔ اس وقت دنیا میں صحیح معنوں میں کوئی دارالاسلام موجود ہی نہیں۔ سب دارالمسلمین ہیں' اور کفر کے غلبہ کی حد تک ان کی حالت دارالکفر سے کچھ بہتر نہیں۔

۳۔ اس کے باوجود دارالمسلمین میں رہنا انسب اور اولیٰ ہے 'پسندیدہ اور قابل ترجیح ہے' اس کے بے شمار فوائد ہیں 'اور بلاعذر معقول دارالکفر میں نہیں رہنا چاہیے۔

۴۔ جتنے مسلمان دارالکفر میں رہتے ہیں' وہاں کے باشندے ہیں یا وہاں جاکر معاشی و تعلیمی اسباب کی وجہ سے آباد ہو گئے ہیں' ان کو کوئی دارالمسلمین اپنے اندر نہیں سمو سکتا۔ ہندوستان میں ۱۵ کروڑ کے لگ بھگ مسلمان ہیں' چین میں ۵ کروڑ' روس میں ۲ کروڑ' اور یورپ میں ۲/ ۳ کروڑ سے زیادہ۔ ان سب کا نہ منتقل ہونا ممکن ہے' نہ ضروری' نہ فرض۔

۵۔ پیدایش کی بنا پر' وطن ہونے کی بنا پر' تعلیم کی بنا پر' اور اگر دارالمسلمین میں ذریعہ معاش میسر نہ ہو تو بہتر معاش کے لیے بھی' دارالکفر میں' جو دارالامن اور دارالصلح ہو' رہنے میں کوئی مضائقہ محسوس نہیں ہوتا۔

۶۔ مسلمان جہاں بھی ہو' دعوت و تبلیغ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس پر فرض ہے۔ مسلمانوں میں بھی اور غیر مسلموں میں بھی۔ چنانچہ آپ بنیادی طور پر اسی فریضہ کی ادایگی کی نیت کیوں نہ کریں اور کام بھی کریں۔ اجر بھی ملے گا' معاش بھی۔ (خ۔م)

جماعت اسلامی سے تقریباً چھ ماہ پہلے متعارف ہوا ہوں۔ ہفتہ وار اجتماع میں باقاعدگی سے شرکت کرتا ہوں۔ اب میری یہ کیفیت ہوگئی ہے کہ جہاد کے بارے میں درس قرآن نے دل کی گہرائیوں تک اثر کیا ہے۔ سوتے جاگتے یہی جذبہ رہتا ہے کہ دشمنان دین کو ختم کر دوں۔ کشمیر' بوسنیا اور فلسطین میں مسلمانوں پر ہونے والے ظلم و ستم کی داستان سنتا ہوں تو بے اختیار آنسو آجاتے ہیں' اور اس مجلس میں بیٹھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن گھر میں بھی عجیب حالت ہے' چار بہنوں کا بوجھ سر پر ہے۔ گھر کے حالات نے بھی میری روح کو زخمی کر رکھا ہے۔ جب والدہ سے اجازت مانگتا ہوں تو وہ بھی اپنی سچی داستان غم سناتی ہیں۔ آخر ان کے آگے بھی سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ یہ بہنوں کی ذمہ داری کیا کشمیر کے جہاد سے کم ہے۔ گھر کی باتوں اور درس نے جیسے میرا سکون چھین لیا ہو۔ نماز میں اور تنہائی کے عالم میں انھیں خیالوں کے بھنور میں کھویا رہتا ہوں۔ بعض دفعہ تو ایسی کیفیت ہو جاتی ہے کہ دیواروں سے ٹکرا کر سر پھوڑنے کو دل چاہتا ہے۔ خدا کے لیے قرآن و حدیث کی روشنی میں میری پریشانی کا حل بتائیں۔ کیا مجھے والدہ کی بات ماننا چاہیے یا پھر مجھے گھر سے بھاگ کر جہاد کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ کیا جہاد میں والدین کی اجازت ضروری ہوتی ہے؟

آپ کے حالات دیکھتے ہوئے میرے نزدیک آپ کے لیے صحیح راہ عمل یہی ہے کہ آپ والدہ کا کہنا مانیں اور چار بہنوں کی خبرگیری کریں۔ جہاد کی ایک ہی صورت نہیں' خصوصاً آج کے دور میں' کہ ہر شخص میدان جنگ میں جاکر شہید ہو۔ بلکہ آج کل ایک آدمی محاذ پر ہو گا' تو ۱۰۰ آدمیوں کو پشت پناہی کرنا ہوگی۔ مجاہد کے لیے ساز و سامان فراہم کرنا' اس کے گھر والوں کی خبرگیری کرنا' یہ بھی جہاد ہے۔ آپ والدہ اور بہنوں کی خبرگیری کے ساتھ ساتھ یہ خدمات انجام دیں۔ اللہ آپ کو جہاد کا اجر دے گا۔ نبی کریم ؐ نے بھی خصوصی حالات میں جہاد سے رخصت بھی دی ہے' اور جہاد کے بجائے والدین کی خدمت کا حکم بھی دیا ہے۔ صاحب امر کی طرف سے نفیر عام نہ ہو تو جہاد فرض عین بھی نہیں۔

جزئیات پر غیر ضروری زور

مسجد کے امام صاحب' ایک حدیث' جو کہ اسوہ رسول اکرم ؐ نامی کتاب کے صفحہ ۳۲۰-۳۲۱ پر درج ہے' منبر کے پاس بیٹھ کر لوگوں کو پڑھ کر سنا رہے تھے۔ اس میں حضور ؐ کے تین زینے چڑھنے کا ذکر تھا۔ میرے ذہن میں منبر رسول کے زینوں کی تعداد کے بارے میں سوال پیدا ہوا۔ کیونکہ تیسرا زینہ تو چبوترہ ہوتا ہے جس پر چڑھا نہیں جاتا۔ مختلف جگہ تلاش کیا' تشفی نہیں ہوئی۔ بعض جگہ زینوں پر چڑھنے کا ذکر ہے۔ بعض جگہ نہیں ہے' مثلاً تحفہ رمضان نامی کتاب میں۔ (سائل نے نہایت تفصیل سے اپنی روداد تلاش بیان کی ہے)۔ اب آپ سے استدعا ہے کہ عالمانہ اور تحقیقی نظر ڈالتے ہوئے بتائیں کہ پہلے' دوسرے اور تیسرے زینوں پہ چڑھنے کے الفاظ کے اضافہ کے ساتھ بیان کردہ حدیث' موضوع حدیث کے زمرے میں آتی ہے یا نہیں؟

آپ نے جس حدیث کے بارے میں سوال کیا ہے' حافظ منذری نے الترغیب و الترھیب میں اس کے ۶ متن نقل کیے ہیں (ج ۲' ص ۵۰۶ تا ۵۰۸)۔ حاکم (قال صحیح الاسناد)، صحیح ابن حبان، البزار اور طبرانی کے متون میں تین درجے / سیڑھیاں چڑھنے کا صاف اور واضح ذکر ہے۔ باقی دو متن' ابن خزیمہ / ابن حبان اور ترمذی کے وہی ہیں جو تحفہ رمضان میں درج ہیں۔ چھٹا متن طبرانی کا ہے جس میں تین درجات کا ذکر نہیں۔ چنانچہ تین زینوں پر چڑھنے کے الفاظ کو اضافہ قرار دے کر' روایت کو موضوع قرار دینا کسی طرح بھی صحیح نہیں۔

روایت عموماً روایت بالمعنی ہوتی ہے۔ کوئی مختصر کر کے روایت کرتا ہے' کوئی تفصیل کے ساتھ۔ اسی لیے آپ تینوں باتوں کی ترتیب بھی روایات میں مختلف پائیں گے۔ حضورؐ کے زمانے میں تین ہی سیڑھیاں ہوں گی' یا ممکن ہے ۴ ہوں۔ اگر ایک سیڑھی بالشت بھر اونچی ہو (۸-۹ انچ)' اور کل اونچائی ایک میٹر (۳۹ انچ) تھی' تو چار بنیں گی یا ہو سکتا ہے حضورؐ اس دن تیسری پر کھڑے ہو گئے ہوں' مختصر سا خطاب کر کے۔ لیکن یہ ایک غیر متعلق بحث ہے۔ بہرحال ۳ اور ۴ کی کئی تاویلیں ممکن ہیں۔ حاکم، ابن حبان، البزار، اور طبرانی کی حدیث کو موضوع نہیں قرار دیا جا سکتا۔

آپ ان فروعی مسائل سے دامن چھڑا کر ان بنیادی مسائل کی طرف اپنی توجہ مرکوز کریں جن پر انسانی زندگی' اسلامی تہذیب' اور ہمارے مستقبل کا انحصار ہے۔ (خ-م)

سوالات کرنے والے بعض افراد اپنا پتہ نہیں دیتے اور لکھ دیتے ہیں کہ جواب ترجمان میں شائع کر دیا جائے۔ ترجمان میں صرف چند سوالات منتخب کر کے شائع کیے جاتے ہیں اور وہ بھی' بعض اوقات' کئی کئی ماہ بعد۔ اس لیے' اگر جواب مطلوب ہے تو ازراہ کرم اپنا مکمل پتہ ضرور لکھیے۔

آپ کی توجہ کے لیے:

ماہ رواں سے ترجمان القرآن کے ایک شمارے کی قیمت -/۱۵ روپے ہے اور سالانہ زر تعاون -/۱۵۰ روپے ہے۔

مینیجر ترجمان القرآن